ڈاکٹر سید نیر مسعود رضوی

خواجہ نصیر الدین محقق طوسی

اور

ان کا عہد

طوس کی خاک سے جو معروف ہستیاں اٹھیں ان میں ابوالقاسم فردوسی، امام غزالی، اور نظام الملک کے ساتھ خواجہ نصیر الدین محمد بن حسن[1] کا نام بھی بہت ممتاز ہے۔ خواجہ نصیر الدین کی مختلف النوع تصنیفیں بتاتی ہیں کہ وہ اسلامیات و الٰہیات، منطق و کلام، فلسفہ و نفسیات، اخلاقیات و سیاسیات، طب و ہیئت، ہندسہ و نجوم اور شعر و ادب وغیرہ پر یکساں عبور رکھتے تھے۔ اسی جلالتِ علمی نے انھیں "محقق" کا گراں قدر خطاب دلایا اور ایران کے متبحر عالموں کی صفِ اوّل میں ان کی جگہ ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لی۔ محقق کو زندہ رہنے کے لیے بڑا پُر آشوب زمانہ ملا لیکن جب ہم دیکھتے ہیں کہ وہ علاء الدین محمد اور رکن الدین غورشاہ کے سے مطلق العنان بادشاہوں کے ساتھ اور پھر ہلاکو خاں اور اباقا خاں کے سے جابر اور سفاک مغل حکمرانوں کی صحبت میں نہ صرف باعزت طور پر رہے بلکہ ان کے ہر دم متغیر مزاجوں میں بڑی حد تک دخیل بھی ہو گئے تو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ وہ حکمت نظری کے ساتھ ساتھ حکمت عملی پر بھی پوری طرح حاوی تھے۔

---

[1] 'مجالس المومنین' میں محقق کا نام نصیر الدین محمد بن محمد اور 'الذریعہ الی تصانیف الشیعہ' (مطبوعہ نجف اشرف ۱۹۳۶ء) میں نصیر الدین محمد بن الحسن لکھا ہے۔ لیکن خود محقق نے اخلاق ناصری کے دیباچے میں اپنا نام "محمد بن حسن المعروف بالنصیر" لکھا ہے اسی قوی تر شاہد کی موجودگی میں اسی نام کو صحیح سمجھنا چاہیے۔

خواجہ نصیر الدین ۱۱ جمادی الاولیٰ ۵۹۷ھ (۱۲۰۰ء) کو طوس میں پیدا ہوئے ان کا اصلی وطن علاقۂ سادہ میں موضع جہرود تھا۔ لیکن جائے پیدائش کی مناسبت سے وہ طوسی مشہور ہو گئے[1]۔ ایک عجیب اتفاق کے ماتحت عین ان کی ولادت کے دن طوس سے بہت دور بغداد میں عباسی خلیفہ ناصر کے حکم سے ان کی والدۂ آرام گاہ بن کر تیار ہوئی (اس واقعہ کی تفصیل آگے آئے گی)۔ خواجہ نے شرعیات میں اپنے والد سے استفادہ[2] کیا جو امام فضل اللہ راوندی کے شاگرد تھے۔ امام فضل اللہ عربی کے جید عالم، شاعر اور ادیب سید مرتضیٰ علم الہدیٰ کے شاگرد تھے۔ علوم عقلیہ میں خواجہ نصیر الدین کا سلسلۂ شاگردی مندرجۂ ذیل واسطوں سے شیخ الرئیس ابو علی ابن سینا تک پہنچتا تھا:

نصیر الدین محمد شاگرد فرید الدین داماد شاگرد سید صدر الدین سرخسی شاگرد افضل الدین گیلانی شاگرد ابو العباس لوکری شاگرد بہمن یار شاگرد شیخ الرئیس۔

ان فاضل اساتذہ کی تعلیمات نے محقق کے جوہر ذات کے ساتھ مل کر ان کو عقلیات و شرعیات میں کمال کے آخری درجوں تک پہنچا دیا۔

مجالس المومنین کی روایت ہے کہ "اوائل حال" میں محقق نے چاہا کہ "مذہب اہل البیت" کی

---

[1] مجالس المومنین

[2] ایضاً (لیکن تذکرۂ آتش کدہ میں اس کی نقیض ایک روایت یہ ہے کہ محقق کے والدان کی پیدائش کی رات ہی کو انتقال کر گئے تھے۔ اصل عبارت یہ ہے "گویند شبے کہ خواجہ نصیر بہ وجود آمدہ والد ماجدش ہماں شب بہ ریاض رضوان خرامیدہ"۔ مجالس المومنین کے بیان کی روشنی میں یہ بیان محل نظر ہے، اور غالباً مستند نہیں ہے اس لیے کہ خود صاحب تذکرہ نے یہ روایت "گویند" کر کے نقل کی ہے جو اُن کے ضعفِ اعتقاد کی دلیل ہے۔ [اخلاق ناصری کا جو ایڈیشن ۱۹۲۴ء میں مطبع نول کشور لکھنؤ میں چھپا تھا اس کے آخر میں یہ روایت "صاحب تذکرۂ آتش کدہ" کے حوالے سے موجود ہے لیکن آتش کدہ کا جو مطبوعہ نسخہ میرے پیش نظر ہے اس میں محقق کا حال اس روایت سے خالی ہے])۔

ترویج کریں [۱]۔ جب انھوں نے دیکھا کہ بغداد میں عباسی خلیفہ معتصم کا وزیر مویّد الدین ابن العلقمی خود "اکابر فضلائے شیعۂ امامیہ" میں سے ہے تو انھوں نے مناسب سمجھا کہ "دار السلام" بغداد کو مرکزِ تبلیغ بنا کر ابن العلقمی کی مدد سے خلیفہ کو مذہب حق کی ہدایت کریں۔ چنانچہ انھوں نے اس بارے میں ابن العلقمی کو ایک خط بھیجا جس کے ساتھ خلیفہ کی مدح میں ایک عربی قصیدہ بھی شامل تھا۔ لیکن ابن العلقمی تک محقق کے علم و فضل کی شہرت پہنچ چکی تھی اس لیے اس نے خلیفہ کے دربار میں ان کی رسائی کو اپنے لیے خلافِ مصلحت سمجھ کر خط کا جواب اور قصیدے کی رسید تک نہ دی۔ وزیر کے اس طرزِ عمل نے محقق کو دل برداشتہ کر دیا اور انھوں نے گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ اس گوشہ نشینی کا ایک سبب مجالس المومنین میں یہ بھی لکھا ہے کہ

"چوں آں نسیم نومیدی بہ مشام خواجہ وزید، دید کہ توقف در بلادِ عراق و خراسان .... بیم فتنہ و خون ریزِ قوم تتار [۲] و چنگیز متعسّر بلکہ متعذّر است، ہموارہ منتظر دار در گوشہ و

---

[۱] حقیقۃً محقق دینیات میں اس درجے پر فائز تھے کہ اپنے مذہب اور عقائد کی تبلیغ کا حق ادا کر سکیں۔ چنانچہ امیر علی شیر نوائی نے اپنے تذکرے میں انھیں "ائمۂ علمائے شیعہ" میں شمار کیا ہے۔ (مجالس النفائس۔ مطبوعہ تہران، ص ۳۲۳)

[۲] مغلوں اور تاتاریوں کو ایک سمجھنا بہت عام غلطی ہے۔ درحقیقت تاتاری مغلوں سے جداگانہ ایک نومیدی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ لفظ تاتار بعید کے ہم معنی ایک چینی لفظ کی بدلی ہوئی شکل ہے۔ بوہار جھیل کے تاتاریوں کے ہاتھ سے چنگیز خاں کو اپنی ابتدائی زندگی میں سخت تکلیفیں اٹھانا پڑی تھیں۔ وہ چنگیز خاں کے جانی دشمن تھے۔ تاتاریوں سے چینی حکومت بھی عاجز تھی۔ کیونکہ وہ لوٹ مار کرتے ہوئے اکثر بڑھ کر دیوارِ عظیم تک ٹکر مار دیتے تھے۔ چنگیز خاں نے حکومت چین کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے تاتاریوں کی سرکوبی کر دی اور چینی شہنشاہ نے اس کارگزاری پر خوش ہو کر اسے خطاب و انعام سے نوازا۔ چنگیز خاں نے یہ شہ بھی ظاہر کیا تھا کہ اس کے باپ لیو کائی بہادر کے قتل میں انھیں تاتاریوں کا ہاتھ تھا۔ تاتاریوں کی سرکوبی میں اس نے اپنے سیاسی حلیف اور منہ بولے باپ طغرل انگ خاں حاکم قراقرم سے بھی مدد لی تھی۔ یہ سب دراصل فتوحات کے اس عظیم الشان سلسلے کی کڑیاں تھیں جس کا نقشہ چنگیز خاں نے بالکل ابتدا ہی میں مرتب کر لیا تھا۔ چنانچہ انگ خاں اسے اپنا بیٹا ہی سمجھتا رہا اور چنگیز خاں نے اسے شکست دے کر قراقرم پر قبضہ کر لیا، اور چینی شہنشاہ اسے اپنا (باقی اگلے صفحہ پر)

کنار روزگارے می گزرانید۔"

یہ واقعات قدرے تشریح کے محتاج ہیں۔

محقق کو بغداد جانے کی خواہش غالباً تین محرکات سے تھی۔ ایک محرک جیسا کہ قاضی نوراللہ شوستری کے مندرجۂ بالا بیان سے ظاہر ہوتا ہے یہ تھا کہ اپنے دینی عقائد کی ترویج و تبلیغ کی جائے اور خلیفہ کو شیعیت کی طرف راغب کیا جائے۔ دوسرا اور غالباً سب سے قوی محرک بغداد کی علمی مرکزیت اور وہاں کے عظیم الشان کتب خانوں کی شہرت تھی۔ خلفائے بنوعباس کی علم دوستی اور بغداد کے دارالخلافت ہونے کی وجہ سے وہاں علوم وفنون کا دور دورہ تھا۔ وہاں کے کتب خانے نادر اور نایاب کتابوں سے چھلک رہے تھے اور بغداد علم وفن کا گہوارہ بنا ہوا تھا۔ محقق خود ایک عالم تھے اور یقیناً علوم کے اس سرچشمے سے سیراب ہونا چاہتے تھے۔ (اس خیال کی تقویت اس روایت سے بھی ہوتی ہے کہ جب فتح بغداد کے بعد مغلوں نے وہاں کے کتب خانوں کو آگ دکھانا شروع کی تو محقق نے بہت سی منتخب کتابیں بچا کر اپنے قبضے میں کرلیں[1])۔ تیسرا محرک مغلوں کے خروج کا اندیشہ تھا۔ نموجن چنگیز خاں جو گوبی کے میدانوں سے دنیا فتح کرنے اٹھا تھا ۱۲۲۰ء میں ایران پر حملہ آور ہوا۔ یہ لشکر کشی سلطان علاء الدین محمد خوارزم شاہ کے خلاف تھی۔ علاء الدین محمد اور اس کے بیٹے جلال الدین محمد نے مغلوں کا سامنا کیا لیکن دونوں کے حصے میں پے در پے شکستیں آئیں۔ زبردست فوجی طاقت کے باوجود سلطنت خوارزم کی دھجیاں اڑ گئیں۔ اسلامی دنیا نے مغلوں کے ہاتھوں وہ مظالم اور مصائب دیکھے جن کا اس سے پہلے تصور بھی نہیں کیا گیا

(گزشتہ صفحہ کا بقیہ حاشیہ)

وفادار قبائلی سردار ہی کہتا رہا اور اس نے دیوار چین میں گھس کر اس کی سلطنت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا جب چنگیز خاں نے اپنی قوت بڑھانے کے لیے نیم وحشی صحرائی قبیلوں کو متحد کرنا شروع کیا تو تاتاری بھی اس کی فوج میں شامل ہوگئے (چین کا مشہور نام "ختا" تاتاریوں ہی کی دین ہے)۔

[1] براؤن: لٹریری ہسٹری آف پرشیا، جلد دوم، ص ۴۸۵

تھا۔ چنگیز خاں اور اس کے مغلوں کے سیل بے پناہ کے آگے سکندر اور اس کے یونانی سوار، ہنی بعل اور اس کے قرطاجنی سورما آلرک اور اس کے وزیگاتھ سپاہی، اٹیلا اور اس کے خونخوار ہون، بساطِ جنگ کے معمولی مہروں کی حیثیت رکھتے تھے۔

مغلوں نے اس لشکر کشی میں خوارزم، خجند، اترار، سمرقند، بخارا، تاشقند، نیشاپور، بلخ، مرو، ترمذ، قزوین اور گنج وغیرہ کو تاراج کر دیا، اور ان میں کے بیشتر شہر ملبے کے ڈھیر ہو گئے۔ تقریباً چالیس لاکھ انسان قتل ہوئے اور شیخ نجم الدین کبریٰ اور فرید الدین عطار کے سے اکابر علم و ادب مغلوں کی بے محابا خونریزی کی بھینٹ چڑھ گئے۔ غرض اس وقت چنگیز خاں کو قہر خدا اور مغلوں کے حملے کو قیامت صغریٰ سمجھا جاتا تھا۔ مغلوں اور سلطنت خوارزم کی اس آویزش میں خلافت عباسی ایک خاموش تماشائی تھی کیونکہ خلیفہ اور سلطان علاء الدین محمد میں ان بن تھی۔ بلکہ خلیفہ نے ایک خفیہ پیغام کے ذریعے چنگیز خاں کو اس بات کا یقین بھی دلا دیا تھا کہ اس کے مقابلے میں خوارزم شاہ کو مدد نہیں دی جائے گی۔ یوں گویا خلیفہ نے چنگیز خاں کی مدد کی تھی۔ ان حالات میں ہر شخص یہ سمجھ سکتا تھا کہ سارا ایران کسی وقت بھی دوبارہ مغل سواروں کی جولاں گاہ بن سکتا ہے لیکن خلافت عباسی کے حدود میں امن رہے گا اور دار الخلافت بغداد وہ مقام ہے جو مغلوں کی دست برد سے ہمیشہ محفوظ رہے گا۔ محقق بھی اسی لیے بغداد میں رہنا چاہتے تھے کہ وہ ان کے نزدیک دار التبلیغ اور دار العلم ہونے کے علاوہ دار السلام بھی تھا۔

ابن العلقمی کا طرز عمل محقق کے لیے بہت مایوس کن تھا۔ انھوں نے اس کے دینی خلوص کا غلط اندازہ لگایا۔ ابن العلقمی کے لیے یہ بات بالکل واضح تھی کہ اگر محقق بغداد آ گئے تو ان کے علم و فضل کے آگے اس کا کمال ماند پڑ جائے گا۔ اور جب وہ خلیفہ کی مذہبی اصلاح کرنا چاہیں گے تو اس کے لیے ضروری ہو گا کہ وہ پہلے خلیفہ کی بارگاہ میں تقرب اور اس کے مزاج میں دخل پیدا کریں۔ پھر اگر کہیں انھوں نے خلیفہ کے خیالات بدل دیے، یعنی اسے یہ یقین آ گیا کہ میں اب تک گمراہ تھا، اور اب خواجہ نصیر الدین طوسی کی بدولت راہِ صواب پر آ گیا ہوں، تب تو ظاہر ہے کہ اس کے

لیے خواجہ نصیرالدین سے بڑھ کر کسی کی ہستی ہی نہیں رہ جائے گی۔ چنانچہ اس نے مصلحت وقت اسی میں دیکھی کہ قصیدہ دبا لے اور خط کا جواب ٹال جائے۔ محقق کے لیے اتنا اشارہ کافی تھا۔ انھوں نے سمجھ لیا کہ مؤیدالدین ابن العلقمی کے ہوتے ان کے لیے بغداد میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ اس شکست تمنا نے انھیں دل برداشتہ کر دیا اور وہ گوشہ نشینی اختیار کر کے خاموشی کے ساتھ علمی مشاغل میں مصروف ہو گئے۔

اور اب قہستان کے اسمٰعیلی حاکم ناصرالدین محتشم کی نظر ان کی طرف اٹھی۔

حسن بن صبّاح کی قائم کی ہوئی اسمٰعیلی سلطنت محقق کے زمانے میں اپنے عروج پر پہنچ چکی تھی اور اس کے حدود بہت پھیل گئے تھے۔ متعدد شہروں، اور کوہستانی قلعوں پر اسمٰعیلی بادشاہ کے مقرر کیے ہوئے عامل اس کی طرف سے حکومت کرتے تھے۔ انھیں میں ولایت قہستان کا حاکم ناصرالدین عبدالرحیم بن ابومنصور بھی تھا۔ ناصرالدین خود بھی عالم تھا۔ اس نے محقق کو اپنے پاس بلا لیا اور عزت کے ساتھ مہمان بنا کر رکھا۔ ناصرالدین ہی کی فرمائش پر محقق نے اپنی مشہور کتاب 'اخلاق ناصری' مرتب کی، اور عین القضاۃ ہمدانی کی کتاب 'زبدۃ الحقائق' کا ترجمہ کیا۔ اس کے بعد الموت میں اسمٰعیلی بادشاہ علاء الدین نے انھیں اپنے پاس طلب کر لیا۔ یہ بات صاف نہیں ہو سکی کہ قہستان میں محقق کے داخلے کا عنوان کیا تھا اور پھر کیا سبب ہوا کہ علاء الدین نے ان کو اپنے ساتھ الموت میں رکھنا مناسب سمجھا۔ مجالس المومنین میں ہے کہ جس زمانے میں خواجہ نصیرالدین گوشہ نشینی کی زندگی بسر کر رہے تھے، ناصرالدین محتشم نے جو "افاضل زمان" اور "احیائے امراءِ علاء الدین محمد" میں تھا، انھیں "بہ لطائف الحیل" اپنے پاس بلا لیا۔ اور جب علاء الدین محمد کو اس کا علم ہوا تو اس نے ان کو "طوعاً وکرہاً" اپنے پاس طلب کیا اور ان کو پورے اعزاز و اکرام کے ساتھ رکھا۔ خواجہ نے جب دیکھا کہ

"فضائے دل آویزِ ایران بہ واسطۂ ترکتازِ چنگیز از فتنہ و آشوب لبریز است و مع ہذا آں جماعتِ اسمٰعیلیہ در اصلِ مذہب تشیع با او شریک بودند و اسباب فراغت و مطالعہ

اورا بہ احسن وجہ مہیا می نمودند لاجرم عمرے بہ عذاب صحبتِ ایشاں گرفتار بود۔"

خود محقق اخلاقِ ناصری کے سبب تالیف میں لکھتے ہیں :

"محمد ابن حسن .... المعروف بالنصیر الطوسی گوید کہ تحریر ایں کتاب کہ موسوم است بہ "اخلاق ناصری" در وقتے اتفاق افتاد کہ بہ سبب تقلّب روزگار جلاے وطن بر سبیل اضطرار اختیار کردہ بود و دست تقدیر اورا بہ مقام خطّۂ کوہستان پائے بند گردانیدہ[1]"

اس عبارت سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ زمانے کی کج روی کے باعث محقق نے جلائے وطن "اختیار" کیا۔ وہ "بر سبیل اضطرار" ہی سہی۔ یعنی ناصرالدین محتشم نے انھیں جبراً طلب نہیں کیا بلکہ زمانے کو پُرآشوب دیکھ کر انھوں نے خود اس کے زیرِ سرپرستی رہنے کو غنیمت سمجھتے ہوئے اس کی دعوت قبول کر لی۔ آگے بڑھ کر واقعات اور الجھ جاتے ہیں۔ محقق کا اسمٰعیلیوں کی سلطنت میں رہنا 'حبس' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ خود محقق نے بھی 'زیج ایلخانی' میں اس کا اظہار کیا ہے۔ اس سلسلے میں ایک بار پھر ایک عربی قصیدے کا ذکر آتا ہے جو محقق نے خلیفہ مستعصم باللہ عباسی کی مدح میں نظم کر کے بغداد بھیجا تھا۔ 'حبیب السیّر' میں لکھا ہے کہ محقق نے کچھ زمانہ ولایت قہستان میں قیام کیا۔ وہاں کا حاکم ناصرالدین محتشم ان کے ساتھ بڑی مہربانی سے پیش آتا تھا۔ انہی دنوں محقق نے کتاب 'اخلاقِ ناصری' تالیف کر کے اس کے نام معنون کی اور خلیفہ مستعصم کی مدح میں ایک عربی قصیدہ تصنیف کر کے بغداد بھیجا۔ ابن علقمی کو یہ بات پسند نہ آئی۔ اس نے اس قصیدے کی پشت پر لکھا کہ مولانا نصیرالدین نے خلیفہ سے خط و کتابت شروع کر دی ہے، تم اس اندیشے سے غافل نہ رہنا۔ یہ لکھ کر وہ قصیدہ ناصرالدین کے پاس بھیج دیا۔ اس پر اس نے محقق کو قید کر لیا اور جب وہ علاء الدین محمد کی خدمت میں قلعۂ الموت یا میمون دِژ کو گیا تو محقق کو ساتھ لیتا گیا، اور انھیں بادشاہ کے سپرد کر دیا۔ اس طرح اس علامۂ زماں کو کچھ دن ملاحدہ کے درمیان رہنا پڑا۔

---

[1] "اخلاق ناصری" مطبوعۂ لکھنؤ ۱۹۲۴ء، ص ۶۔

عبداللہ بن فضل اللہ شیرازی بھی اپنی تاریخ وصّاف میں بھی واقعہ بیان کرتا ہے کہ:

"مولانائے اعظم، شارح علوم الاوّلین والآخرین، نصیر الملۃ والدین محمد طوسی.... مدّتہا در خطۂ قہستان موقوف بود...... وگفتہ اند احتباس را سبب ہمیں بودہ کہ قصیدہ اے از منشاتِ خود بہ حضرتِ مستعصم فرستاد۔ ابن علقمی بر ظہر آں بہ مجلس ناصر الدین محتشم انہا کرد کہ مولانا نصیر الدین مکاتبات و منشات با دیوان عزیز مجدہ اللہ آغاز کردہ، از غوائل و تبعاتِ او اندیشہ باید کرد۔ ناصر الدین متغیّر شد و بعد ہا کہ بہ نظر اجلال و تعظیم و اکرام و تفخیم جانب چناں علامۂ روزگار و حکیم بزرگوار را ملاحظہ کردے، اورا بازداشت فرمود۔"

بظاہر اس کا امکان نظر نہیں آتا کہ ایک بار ابن العلقمی کی سرد مہری دیکھ لینے کے باوجود محقق نے پھر خلیفہ تک رسائی کی کوشش کی ہو۔ لیکن واقعات کی صورت یہ بھی سمجھی جا سکتی ہے کہ پہلی بار ناکامی کے بعد محقق نے ناصر الدین کی سرپرستی میں رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ کچھ عرصے کے بعد وہ اسمٰعیلیوں کی صحبت سے اکتا گئے اور ایک بار پھر ان کے دل میں بغداد جانے کی خواہش ابھری۔ چونکہ پہلی بار ابن العلقمی نے ان کا قصیدہ خلیفہ تک پہنچنے ہی نہیں دیا تھا اس لیے اس مرتبہ انھوں نے وہی یا دوسرا قصیدہ براہِ راست یا ابن العلقمی کے بجائے کسی اور کے توسط سے خلیفہ کے پاس بھیجا۔ یہ قصیدہ پھر خلیفہ تک پہنچنے سے پہلے ہی ابن العلقمی کے ہاتھ میں پڑ گیا۔ اس نے اس طرح اپنے نظر انداز کیے جانے اور محقق کے اس سازشی انداز پر جھلّا کر فطرۃً یہ کارروائی کی تاکہ آئندہ وہ اس قسم کی کوئی کوشش نہ کر سکیں۔ جب یہ قصیدہ ابن العلقمی کی تحریر کے ساتھ ناصر الدین محتشم کے پاس پہنچا تو اسے بھی فطری طور پر غصّہ آیا کہ اس قدر اعزاز و اکرام کے باوجود خواجہ نصیر الدین دوسرے سرپرستوں کی تلاش میں ہیں۔ چنانچہ اس نے ان کو علاء الدین محمد کے حوالے کر دیا جس نے ان کی تعظیم و تکریم اور خاطر تواضع میں تو کمی نہیں کی لیکن یہ پابندی ضرور لگا دی کہ اب آپ ان حدود سے باہر نہیں جا سکتے۔ اس طرح محقق براؤن کے الفاظ میں " ایک معزز لیکن مجبور مہمان کی حیثیت

سے اسمٰعیلی قلعوں میں زندگی گزارنے لگے۔"

علاء الدین محمد اسمٰعیلیوں کا آخری بڑا بادشاہ تھا۔ وہ اپنے باپ جلال الدین حسن کی موت پر نو برس کے سن میں ۲ یا ۳ نومبر ۱۲۲۰ عیسوی کو تخت پر بیٹھا۔ وہ مالیخولیائی مزاج کا آدمی تھا اور اس تک کوئی ناگوار خبر پہنچانا ایک مشکل مرحلہ ہوتا تھا۔ ناصر الدین محتشم نے یقیناً نہایت شائستہ عنوان سے محقق کو اس کے سامنے پیش کیا ہوگا اور یقیناً محقق بھی محسوس کرتے ہوں گے کہ اس کے سامنے کوئی خلاف مزاج بات کرنا اپنی جان کا خطرہ مول لینا ہے۔ اسمٰعیلیوں کے مذہبی عقائد چھٹے امام حضرت جعفر صادق علیہ السلام تک اثنا عشری شیعوں کے عقائد کے ساتھ چلنے کے بعد ان سے الگ ہو جاتے ہیں۔ محقق کو دوران گفتگو میں ہمہ وقت اس بات کا لحاظ رکھنا پڑتا ہوگا کہ کوئی بات بادشاہ کے عقائد کے خلاف منہ سے نہ نکل جائے، درحالے کہ محقق خود اثنا عشری شیعہ تھے، ان کے اپنے عقائد بادشاہ کے عقائد سے مختلف تھے اور وہ اپنے عقائد میں راسخ بھی تھے۔ ظاہر ہے کہ اس ہر دم چوکنے پن کی زندگی اور دمِ تیغ پر قدم زنی سے وہ عاجز آ گئے ہوں گے لیکن اب اسمٰعیلیوں کے شکنجے سے ان کی رہائی کے دن قریب آ گئے تھے۔ وہ یوں کہ علاء الدین محمد اور اس کے بیٹے رکن الدین خورشاہ کے مابین اختلافات پیدا ہو گئے، یہاں تک کہ علاء الدین محمد آخر شوال ۶۵۳ھ (دسمبر ۱۲۵۵ء) میں شیر کوہ میں قتل کر دیا گیا۔ اس کے قاتل حسن مازندرانی کو رکن الدین خورشاہ نے قتل کر کے اس کی لاش جلوا دی۔ لیکن رشید الدین فضل اللہ صاحب جامع التاریخ کے قیاس کے مطابق حسن نے رکن الدین ہی کے اشارے پر اس کے باپ کو قتل کیا تھا۔ بہرحال رکن الدین خورشاہ اپنے باپ کے تخت پر بیٹھا۔ اس نے بھی محقق کو اسی اعزاز و اکرام کا مستوجب رکھا جو انھیں علاء الدین اور ناصر الدین کے زمانے میں حاصل تھا۔ لیکن محقق کو رکن الدین کی سرپرستی اور رکن الدین کو محقق کی صحبت ایک سال سے زیادہ نہ رہ سکی۔

رکن الدین خورشاہ تخت سلطنت پر اپنی نشست بھی درست نہ کر پایا تھا کہ اسمٰعیلی قلعوں کے سامنے چنگیز خاں کو پوتا ایلخاں ہلاکو ابن تولی نمودار ہوا۔ اس کے پیچھے خونخوار مغلوں کا ٹڈی دل

لشکر تھا۔ اور تاریخ ایک بار پھر ہلاکت اور خونریزی کے ہولناک مناظر دیکھنے کے لیے تیار ہو گئی۔

ہلاکو خاں چنگیز خاں کے سب سے چھوٹے بیٹے اور امیر جنگ تولی خاں کا بیٹا تھا۔ ۱۲۲۷ء میں چنگیز خاں کی وفات کے بعد اس کا بیٹا اوگتائی تخت نشین ہوا۔ اوگتائی کی موت پر اس کے بیٹے کیوک نے حکومت کی۔ کیوک کے بعد مغل سلطنت کی باگ ڈور اوگتائی کی نسل کے ہاتھ سے نکل کر تولی خاں کی اولاد کے ہاتھ میں آئی اور اب منگو خاں ابن تولی خانِ اعظم منتخب ہو کر مغلوں کے دارالسلطنت قراقرم میں تخت پر بیٹھا۔ منگو خاں نے اپنی تخت نشینی کے پہلے ہی سال مغل فتوحات کے ایک بہت بڑے منصوبے کے تحت ہلاکو خاں کو ایران روانہ کیا۔ اس کے ساتھ چنگیز خاں کے ایک بڑے نامور سردار اور دست راست سوبدائی بہادر کا بیٹا بھی تھا[۱]۔ ہلاکو ۱۲۵۲ء میں قراقرم سے روانہ ہوا۔ اس کی پیش قدمی کی رفتار ابتدا میں بہت سست تھی۔ وہ نہایت اطمینان کے ساتھ کوچ اور قیام کرتا ہوا ۱۲۵۶ء میں کیش پہنچا۔ کیش میں اس نے مغل گورنر جنرل برائے ایران، ارغون سے ملاقات کی۔ وہیں عطا ملک جوینی اس سے ملا اور بعد میں اس کا معتمد ہو گیا[۲]۔ کیش سے نکل کر ہلاکو خاں کی رفتار میں تیزی آئی اور اب مغلوں نے حملہ آوروں کے انداز میں یلغار شروع کی۔ اسمٰعیلیوں کے قلعوں پر قبضہ کرتا اور ان کے باشندوں کا بے دریغ قتل عام کرتا ہوا مغل لشکر اسی سال نومبر کے مہینے میں اسمٰعیلیوں کے صدر مقام قلعۂ الموت کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

رکن الدین خورشاہ اور اس کی فوج میں اتنی طاقت نہ تھی کہ مغلوں کا حملہ روکا جا سکتا۔ چنانچہ اس نے محقق کے مشورے سے اپنے آپ کو مغلوں کے حوالے کر دیا۔ ناصر الدین محتشم نے بھی مغلوں

---

[۱] چنگیز خاں: از ہیرلڈ لیمب، ص ۱۸۱

[۲] لٹریری ہسٹری آف پرشیا: از پروفیسر براؤن۔ جلد دوم ص ۴۵۱ تا ۴۵۳

کی اطاعت قبول کرلی۔ ہلاکو اس سے اچھی طرح پیش آیا اور اسے ایک معزز عہدے پر مامور کر دیا گیا لیکن وہ بہت بوڑھا ہو چکا تھا۔ تھوڑے دن بعد ہی مر گیا۔ رکن الدین کے ساتھ بھی ہلاکو نے اچھا برتاؤ کیا، مگر جب اس کو خان اعظم منگو خاں کے پاس قراقرم بھیجا گیا تو منگو خاں نے اسے قتل کرا دیا۔ اس وقت رکن الدین کی عمر ستائیس اور اٹھائیس سال کے درمیان تھی۔ رکن الدین کے ساتھ ایران میں تقریباً پونے دو صدی پرانی اسمٰعیلی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔

رکن الدین خورشاہ سے گفت و شنید کے دوران میں ہلاکو محقق سے روشناس ہوا۔ چونکہ محقق ہی نے رکن الدین کو مغلوں کی اطاعت قبول کر لینے پر آمادہ کیا تھا، اس لیے ہلاکو ان سے خوش بھی تھا۔ اسمٰعیلیوں کے استیصال کے بعد اس نے محقق کو اپنے ساتھ رکھا۔ وہ ان کی بہت عزت کرتا تھا اور اکثر اہم امور میں ان سے مشورہ ضرور کرتا تھا۔ آتش کدہ میں لکھا ہے:

"[خواجہ نصیر الدین] در استیلائے ایلخاں از حبس خلاصی یافتہ و ملازم رکاب او بودہ و نوازشات از آں بادشاہ می یافتہ و آں بادشاہ نیز استفادۂ اکثر امور از رائے صواب نمائے او می کردہ۔"

پروفیسر براؤن ایران کی ادبی تاریخ میں لکھتے ہیں کہ محقق ہلاکو کے وزیر کے درجے تک پہنچ گئے تھے [1]۔

اسمٰعیلیوں کی قید سے رہائی پا کر محقق کی ایک خواہش تو پوری ہو گئی۔ مگر ابھی بغداد جانے کی تمنا محروم تکمیل ہی تھی۔ آخر یہ تمنا بھی پوری ہوئی لیکن نہایت المناک حالات میں۔

ہلاکو خاں نے اسمٰعیلیوں کی مہم سے فارغ ہو کر مزید تیاریوں کے ساتھ اپنے لشکر کو یلغار کا حکم دیا اس وقت اس کا رخ دار الخلافت بغداد کی طرف تھا۔

---

[1] لٹریری ہسٹری آف پرشیا: از پروفیسر براؤن۔ جلد دوم۔ ص ۴۵۱ تا ۴۵۳

بغداد کا محاصرہ اور مغلوں کے ہاتھوں اس کی تباہی تاریخ کے معروف واقعات ہیں۔ قتل و غارت اور انہدام و آتش زنی کے وہی سارے مناظر یہاں بھی دہرائے گئے، جنھیں آنکھیں دیکھتی تھیں مگر دل یقین نہیں کرتے تھے۔ خلیفہ مستعصم باللہ کو نمدے میں لپیٹ کر کچل دیا گیا اور آلِ عباس کا سیاہ جھنڈا جو پانچ سو برس سے لہرا رہا تھا سرنگوں ہو گیا۔

ان تمام واقعات میں محقق کا نام کچھ اس طرح آتا ہے گویا خلافتِ عباسیہ کا زوال انھیں کا لایا ہوا تھا۔ علاوہ بریں اسمٰعیلیوں کی تباہی میں بھی محقق ہی کو کارفرما بتایا جاتا ہے۔ اور اسی بنا پر بعض مؤرخوں نے انھیں محسن کش اور غدار قرار دیا ہے۔ پروفیسر براؤن لکھتے ہیں کہ نصیر الدین طوسی مصنف اخلاق ناصری کو قہستان کے اسمٰعیلی گورنر ناصر الدین نے اغوا کر کے الموت بھیج دیا تھا جہاں وہ ایک "معزز، اگرچہ مجبور" مہمان کی طرح رکھے گئے۔ یہاں تک کہ قلعۂ الموت پر مغلوں کا قبضہ ہو گیا۔ اس واقعے کی تاریخی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ نصیر الدین طوسی ہی تھے جنھوں نے پہلے رکن الدین خورشاہ کو بے دین مغلوں کے آگے ہتھیار ڈالنے پر آمادہ کیا اور بعد میں [عہم بغداد کے موقعے پر] ہلاکو خاں کو اطمینان دلایا کہ خلیفہ مستعصم کو قتل کرنے پر کوئی آسمانی عذاب نہیں نازل ہو گا [1]۔ اس کے بعد نہایت حیرت کے ساتھ لکھتے ہیں:

"کیا ستم ظریفی ہے کہ ایسا دورُخا غدّار ایران کی مشہور ترین کتب اخلاق میں سے ایک کا مصنف ہو!" [2]

لیکن محقق پر غداری کا الزام لگانا بجائے خود ستم ظریفی ہے۔ غدار وہ ہوتا ہے جو اپنے محسن یا ولی نعمت کے ساتھ دغا کرے۔ اسمٰعیلیوں اور عباسیوں میں ہم کسی کو محقق کا محسن یا

---

[1] لٹریری ہسٹری آف پرشیا، جلد دوم ص ۵۷ - ۴۵۶

[2] " " ص ۴۵۷

دلی نعمت نہیں پاتے۔ اسمٰعیلی بادشاہوں کا برتاؤ محقق کے ساتھ بہت دوستانہ سہی لیکن اس حقیقت کا کون انکار کرسکتا ہے کہ محقق وہاں قیدی کی حیثیت رکھتے تھے اور ان کو نقل وحرکت میں آزادی حاصل نہیں تھی۔ اس کے باوجود محقق نے کوئی غداری نہیں کی۔ رکن الدین کو مغلوں کی اطاعت قبول کرنے پر آمادہ کرنا اس کے حق میں بہتر ہی تھا۔ کیونکہ اس صورت میں ہلاکو نے اس کی جاں بخشی کردی تھی، اور ایک مغل دوشیزہ اس کے حق میں دے دی تھی۔ یہ اس کی بدقسمتی تھی کہ اسے قراقرم بھیج دیا گیا اور منگو خاں نے اس کے قتل کا حکم دے دیا۔ خلافتِ عباسی کے ساتھ بھی محقق کی کوئی وابستگی نہیں تھی۔ اس دربار میں تقرب پانے کی خواہش انھیں ضرور تھی لیکن کوششوں کے باوجود ان کی یہ خواہش پوری نہیں ہوئی۔ محقق کے دینی عقائد کی رو سے عباسیوں کی پوری خلافت ہی غصبی اور سزاوار انتزاع تھی۔ اس لیے کہ خلفائے بنوامیہ کی طرف عباسی خلفاء کا دامن بھی شیعوں کے ائمہ اثنا عشر میں سے کئی بزرگواروں کے خون سے رنگین تھا۔ شیعی عقائد کے لحاظ سے اتنے سخت گناہوں کی پاداش میں خلافت عباسیہ کا تہس نہس ہوجانا، قضائے الٰہی کے عین مطابق تھا۔ اور اس موقع پر خلافت کو بچانے اور برقرار رکھنے کی کوشش کرنا گویا خدائی انصاف کا انکار اور منشائے قدرت سے اختلاف کرنا تھا۔ یہ سب ایک طرف اور دوسری طرف حقیقت یہ تھی کہ ہلاکو قراقرم سے چلا ہی اس غرض سے تھا کہ اسمٰعیلیوں اور عباسیوں کی سلطنت کا خاتمہ کردیا جائے۔ اس نے اپنے فوجی اقدامات کا مکمل نقشہ بنایا اور اسی کے مطابق دونوں سلطنتوں کا تختہ الٹ دیا جن کی ذمہ داری سو فی صدی مغلوں پر ہے۔ یہ سمجھنا محض غلط ہے کہ یہ فتوحات محقق کے اشارے یا تحریک پر ہوئے تھے۔ منظم، چوکس اور چالاک مغلوں کے متعلق یہ خیال کرنا کہ اتنے بڑے اقدام انھوں نے ایک اجنبی سرزمین کے اجنبی شخص کی تحریک پر کیے ہوں گے، ان کے اندازِ اطوار کے متعلق سخت غلط فہمی کا ثبوت دینا ہے۔ ابن العلقمی کو البتہ غدّار کہا جاسکتا ہے۔ اس نے فتح بغداد میں مغلوں کی ہر امکانی مدد کی اور مغل بہت کچھ اس کے ممنون کرم تھے۔ لیکن فتح بغداد کے بعد انھوں نے اس کے اس احسان کا بدلہ صرف یہ دیا کہ اس کو قتل نہیں کیا۔ چنگیز خاں کے وقت ہی

سے مغلوں کی تاریخ میں ایسے واقعات ملنے لگتے ہیں کہ انھوں نے اپنا مطلب حاصل ہو جانے کے بعد ان اشخاص کو قتل کر دیا جنھوں نے اپنے بادشاہ سے غداری اور مغلوں کی طرف داری کی تھی۔ اس کی توجیہہ یہ کی جاتی تھی کہ جو اپنے بادشاہ کا نہ ہو سکا وہ ہمارے لیے بھی خطرناک ثابت ہو سکتا ہے ابن العلقمی کو بھی یہی الفاظ سننا پڑے، اور زوال بغداد کے بعد اس کی بقیہ زندگی نہایت ذلت اور دل شکستگی کے عالم میں گزری۔ اس کے برخلاف محقق کو مغل کیمپ میں جو عزت حاصل تھی وہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ مغل بھی ان کو غدار اور محسن کش نہیں سمجھتے تھے۔

فتح بغداد کے بعد ہلاکو خاں کی طرف سے محقق نے عربی زبان میں فتح نامہ لکھا جو وصاف نے اپنی تاریخ میں درج کر دیا ہے۔ مغلوں کے ساتھ رہ کر محقق کو جنگ اور خوں ریزی کے ہولناک مناظر سے سابقہ تھا۔ آخر انھوں نے ہلاکو سے کہہ کر اپنے لیے مراغہ میں ایک عالی شان رصد گاہ بنوالی تاکہ پھر سے اپنی علمی زندگی کا آغاز کر سکیں۔ وہیں انھوں نے اپنی مشہور زیج ایلخانی بھی مرتب کی۔ وصاف مراغہ کی رصد گاہ کے بیان میں لکھتا ہے کہ جب ہلاکو خاں بغداد وغیرہ کی مہموں سے فارغ ہو چکا تو

"سلطان الحکماء المحققین، نصیر الملۃ والدین در بندگی تخت سلطنت عرضہ داشت کہ اگر رائے غیب دان ایلخان منصوب باشد از برائے تجدید احکام نجوم وتحقیق ارصاد منوالیات رصدے سازد وزیجے استنباط کند و بہ اصابت فکر دور بین ورائے ہندسہ کشائے احتیاط ایلخاں را از حوادث مستقبلات شہور و اعوام واحکام محاولات خاصہ وعام اعلام واجب داند واز تسییر طالع وتقسیم مطالع وتوجیہہ سالہا فرد اریہ کند۔" [1]

اس کے بعد زیج اور رصد گاہ کی مبالغہ آمیز تعریف کی گئی ہے۔

---

[1] تاریخ وصاف، ص ۱۵

زیج کی ترتیب اور رصدگاہ کی تعمیر میں خاص اہتمام کیا گیا۔ فخر الدین مراغی، مویّد الدین عرضی، نجم الدین کاتبی اور محی الدین افلاطی وغیرہ مسلمان ماہرین ہیئت کے علاوہ بعض چینی منجموں نے بھی زیج کی ترتیب میں محقق کا ہاتھ بٹایا۔ محقق کے سب سے ممتاز شاگرد مُلّا قطب الدین شیرازی نے اس سلسلے میں سب سے زیادہ کام کیا تھا۔ لیکن محقق نے ان کا نام دوسرے لوگوں کے ساتھ خطبۂ کتاب میں درج نہیں کیا۔ یہ امر مُلّا قطب الدین کو ناگوار ہوا اور اسی وجہ سے جب زیج کی بعض خامیوں کی اصلاح کی ضرورت ہوئی تو اصلاح کی قدرت رکھنے کے باوجود انھوں نے اس کام سے انکار کر دیا۔ [1]

رصدگاہ کی تعمیر ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی کہ ۸ر فروری ۱۲۶۵ء کو ایلخان ہلاکو کا انتقال ہو گیا۔ مغلوں کے شاہی دستور کے مطابق ایک بڑی قبر کھودی گئی جس میں ہلاکو کے جسم کے ساتھ بڑی مقدار میں زر و جواہر کے علاوہ کئی حسین و جمیل دوشیزائیں بھی دفن کر دی گئیں تاکہ قبر کی تنہائی سے خان کا دل نہ گھبرائے [2] محقق نے ہلاکو خاں کی تاریخ وفات مندرجۂ ذیل قطعے سے نکالی:

چوں ہلاکو ز مراغہ بہ زمستاں گمہ شد　　کرد تقدیر اجل نوبت عمرش آخر
سال بر شش صد و شصت و سہ شب یکشنبہ　　کہ شب نوزدہم بُد ز ربیع الآخر [3]

ہلاکو خاں محقق کا سب سے بڑا سرپرست تھا۔ اس کی صحبت سے محقق کو بہت فائدے حاصل ہوئے۔ ان کو تصنیف و تالیف کی ساری سہولتیں مل گئی تھیں۔ فتح بغداد کے موقعے پر انھوں نے بغداد کے برباد ہوتے ہوئے کتب خانوں کی چار لاکھ سے زیادہ کتابیں اپنے لیے الگ کر لی تھیں [4]۔ یقیناً یہ نہایت اہم اور نادر کتابیں ہوں گی جن سے محقق نے اپنے علمی کاموں میں بہت استفادہ کیا ہوگا۔ ہیئت اور

---

[1] مجالس المومنین

[2] تاریخ وصاف ص ۵۲

[3] ایضاً　　ص ۵۲

[4] فواۃ الوفیاۃ از ابن شاکر، جلد دوم ص ۱۴۹ [بحوالہ پروفیسر براؤن]

نجوم میں محقق کی مہارت کی وجہ سے ہلاکو خاں کو خاص کر ان کے مشوروں کی اکثر ضرورت پیش آیا کرتی تھی کیونکہ ہر اہم معاملے میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے وہ محقق کے ذریعے ستاروں کی رفتار وغیرہ کا شگون لے لیا کرتا تھا۔ بغداد پر حملے کے وقت ہلاکو نے محقق ہی سے اس مہم کے نتیجے کے متعلق دریافت کیا تھا۔ اور محقق نے نجوم کے ذریعے یہ خبر دی تھی کہ بغیر کسی خاص زحمت کے بغداد پر مغلوں کا قبضہ ہو جائے گا [۱]۔ یہ روایت بھی ملتی ہے کہ محقق نے ہلاکو خاں کو یقین دلایا تھا کہ خلیفہ مستعصم کا قتل کسی آسمانی قہر کا سبب نہیں بنے گا [۲] (غالباً انہی دو روایتوں کی بنا پر محقق کو بغداد کے زوال کا ذمہ دار قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن جیسا کہ تاریخ بتاتی ہے محقق کی یہ دونوں پیشین گوئیاں صحیح نکلیں)۔ فتح بغداد کے بعد سے محقق کو ہلاکو خاں کا بہت قرب حاصل ہو گیا تھا۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ محقق کی رائے پر ہلاکو نے اپنے ارادے بدل دیے۔ چنانچہ ایک موقعے پر جب وہ صاحب دیوان علاء الدین جوینی اور بعض دوسرے لوگوں کو قتل کرانے جا رہا تھا، محض محقق کے کہنے پر اس نے ان کو معاف کر دیا۔

ہلاکو کے بعد بھی محقق کے مرتبے اور تعظیم و تکریم میں کمی نہیں آئی۔ ہلاکو کے بیٹے اور جانشین اباقا خاں تخت نشینی کی تاریخ (۱۹ رجون ۱۲۶۵ء) محقق ہی سے معین کرائی گئی [۳]۔ ایک بار اباقا خاں زخمی ہو گیا تھا اور کوئی شاہی طبیب اس کے زخم کو ٹھیک نہیں کر پا رہا تھا تو محقق کو اس کے علاج کے لیے بلایا گیا اور انھوں نے اس زخم کو درست کر دیا [۴]۔ یہ واقعہ ۶۶۹ ہجری مطابق ۱۲۷۰-۷۱ عیسوی کا ہے۔

---

[۱] "انخلاص آں جا بے تحمل مزید کلفتے بر دست مواکب منصور میسر خواہد شد و مدت امامت و خلافت بسر۔"
(تاریخ وصاف)

[۲] D'Ohsson جلد سوم (بحوالہ پروفیسر براؤن)

[۳] لٹریری ہسٹری آف پرشیا جلد سوم ص ۱۷

[۴] ایضاً جلد سوم ص ۱۸

اس کے ایک ہی سال کے اندر خود محقق کے لیے پیغام قضا آپہنچا۔ "مجالس المومنین" میں محقق کی وفات کا حال یوں درج کیا گیا ہے:

(ترجمہ) "کہتے ہیں کہ جب خواجہ دوسری مرتبہ بغداد گئے تو ان پر مرض الموت طاری ہو چکا تھا۔ جس وقت وہ اپنی تجہیز و تکفین اور غسل و تدفین کے بارے میں "فضلا سے مومنین" کو وصیت فرما رہے تھے، حاضرین میں سے ایک شخص نے کہا کہ خواجہ کی میت کو حضرت امیرالمومنین علی علیہ السلام کے مشہد مقدس (نجف اشرف) میں لے جاکر دفن کرنا چاہیے۔ لیکن خواجہ نے "کمالِ اخلاص" کی بنا پر فرمایا کہ مجھے شرم آتی ہے کہ حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے جوار میں مروں اور ان کا آستانہ چھوڑ کر کسی اور جگہ، وہ اس سے افضل و اشرف ہی سہی، جاکر دفن ہوں۔ چنانچہ خواجہ کی وصیت کے مطابق ان کو کاظمیہ میں دفن کیا گیا۔ لوحِ مزار کی جگہ جو ستون خواجہ کے مزار پر قائم کیا گیا، اس پر یہ آیۂ کریمہ لکھی گئی:

"کلبھم باسط ذراعیہ بالوصید" [1]

حضرت خواجہ کی تاریخ رحلت اس قطعے سے نکلتی ہے:

نصیر ملت و دین بادشاہِ کشورِ فضل — یگانہ اے کہ چو او مادرِ زمانہ نہ زاد
بہ سالِ شش صد و ہفتاد و دو بہ ذوالحجہ — بروز ہیجدہم[2] اندر گزشت در بغداد[3]

محقق کے مدفن کے متعلق جس دلچسپ اور عجیب واقعے کی طرف شروع میں اشارہ کیا گیا تھا وہ یہ ہے کہ جس وقت ان کے حسب وصیت ان کی قبر کے لیے امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے جوار میں

---

[1] سورۂ کہف

[2] لیکن حمداللہ مستوفی کی "تاریخ گزیدہ" میں ہیجدہم کی جگہ ہفتدہ لکھا درج ہے ("تاریخ گزیدہ" مطبوعہ لندن ۱۹۱۰ء ص ۸۱۰)

[3] "مجالس المومنین"۔

زمین کھودی جارہی تھی۔ اچانک ایک بنا بنایا سرد ابہ کاشی کاری کے کام سے مزیّن برآمد ہوا۔ تفتیش کرنے پر معلوم ہوا کہ عباسی خلیفہ الناصرلدین اللہ نے یہ سردابہ خاص اپنے واسطے بنوایا تھا لیکن اس کو اس میں دفن ہونے کی سعادت نصیب نہ ہوسکی اور وہ رصافہ میں دفن ہوا۔ محقق کو اسی سردابے میں دفن کیا گیا۔ حیرت خیز امر یہ ہے کہ وہ سردابہ عین ان کی ولادت کے دن یعنی ۱۵ رجمادی الاوّل سن ۵۹۷ ہجری کو بن کر تیار ہوا تھا[1]۔

محقق کی اولاد ان کی طرح مشہور نہ ہوسکی۔ ان کے دو بیٹوں اصیل الدین اور صدر الدین کا ذکر تاریخ میں ملتا ہے۔ اصیل الدین کو مغل بادشاہ الجایتو خاں نے مراغہ کی رصدگاہ کا نگراں مقرر کیا تھا۔ مجمل فصیحی کے مطابق اصیل الدین نے ۱۵-۱۳۱۴ء/ ۷۱۴ھ میں انتقال کیا[2]۔ صدرالدین نے ایلخانی دور کے مشہور مؤرخ صاحب دیوان عطا ملک جوینی مصنف تاریخ جہاں کشا کے قتل ہونے کی تاریخ لکھی تھی جو حسب ذیل ہے:

آصف عہد، علاء حق و دیں ، زبدۂ کون کرد پدرود جہاں را چو سرآمدش جہاں
درشب شنبہ ، چہارم زمہ ذی حجہ سال بر شش صد و ہشتاد و یکی در اّران[3]

محقق کے علمی اور ادبی آثار کا دائرہ بہت وسیع ہے، جس کا مکمل احاطہ کرنے اور محقق کی کتابوں کا کماحقہٗ تعارف کرانے کے لیے ایک علیحدہ طویل مقالہ بلکہ ایک پوری کتاب درکار ہے۔ ذیل میں ان کی چند کتابوں کی فہرست درج کی جاتی ہے جو محقق کے علمی تبحّر کا کافی ثبوت ہے۔ ان میں عربی و فارسی دونوں زبانوں کی کتابیں شامل ہیں:

۱- "کتاب تحریر" در کلام

---

[1] "جامع التواریخ" رشید الدین فضل اللہ (بہ حوالہ قاضی نوراللہ شوستری)

[2] مجمل فصیحی (بہ حوالہ پروفیسر براؤن)

[3] ایضاً

۲ - "کتاب تجرید" در منطق

۳ - "اساس الاقتباس" در منطق

۴ - "شرح اشارات" در ہیئت و نجوم

۵ - "تحریر اقلیدس" 〃

۶ - "تحریر مجسطی" 〃

۷ - "تحریر متوسطات" 〃

۸ - "زیج ایلخانی" 〃

۹ - "تذکرہ در ہیئات" 〃

۱۰ - "رسالۂ معینیہ" 〃

۱۱ - "رسالۂ سی فصل" 〃

۱۲ - "رسالہ بیست باب در معرفت اصطلاب"

۱۳ - "کتاب جامع الحساب بالتخت و التراب"

۱۴ - "قواعد العقائد"

۱۵ - "شرح محصل"

۱۶ - "رسالہ اے در جبر و قدر"

۱۷ - "رسالۂ اجوبۂ مسئولات شیخ صدرالدین قونوی"

۱۸ - "رسالہ ردّ ایراد کاتبی بر دلیل حکماء در اثبات واجب تعالیٰ"

۱۹ - "رسالہ در بحث امامت"

۲۰ - "ترجمۂ کتاب" زبدۃ الحقائق" عین القضاۃ ہمدانی

۲۱ - "شرح مشکلات زبدۃ الحقائق" بہ فرمائش امیر ناصرالدین محتشم

۲۲ - "اخلاق ناصری" ترجمہ "طہارۃ النفس" ابوعلی احمد بن محمد بن یعقوب بن مسکویہ خازنِ رازی،

بفرمائش ناصر الدین محتشم

۲۳ - "شرح کتاب ثمرۂ بطلیموس" بہ فرمائش خواجہ بہاء الدین بن خواجہ شمس الدین صاحب دیوان۔

۲۴ - "رسالہ در فقہ مواریث"

۲۵ - "رسالہ در تحقیق نفس الامر"

۲۶ - "رسالہ در تحقیق ماہیت علم"

۲۷ - "رسالۂ فصول"

۲۸ - "رسالہ اوصاف الاشراف"

۲۹ - "شرح سلامان و السال"

۳۰ - "ایک مختصر رسالہ اپنے عقائد کے بیان میں

۳۱ - "بوستان الکرام"

۳۲ - "معیار الاشعار"

۳۳ - "تنسوق نامہ ایلخانی"

محقق کی تقریباً چھپن کتابوں کا اب تک پتہ لگ چکا ہے۔ ممکن ہے ان کے علاوہ کچھ کتابیں ایسی بھی ہوں جن پر امتداد زمانہ اور فراموشی کی گرد جم گئی ہو۔

قاضی نور اللہ شوستری مجالس المومنین میں محقق کے تصوف کا ذکر یوں کرتے ہیں:

"ازیں رسالہ (اوصاف الاشراف) و بعضے از مواضع رسالہ فصول و شرح سلامان و ابسال . . . . معلوم می شود و حضرت خواجہ از منائے کمان ارباب تصوف و اشراق، و انفاس قدسی او از لذات دنیوی فارغ، و صاحب اطلاق بود، چنانچہ ایں قطعہ از اشعار لطائف او نیز برآں دلالت دارد:

لذات دنیوی ہمہ ہیچ است نزد من — در خاطر از تغیر آں ہیچ ترس نیست

روز تنعم و شب عیش و طرب مرا — غیر از شب مطالعہ و روز درس نیست

اور یہ عین ممکن ہے کہ محقق کا رجحان تصوف کی طرف ہو گیا ہو۔ مغلوں کے ہاتھوں انسانی جانوں کی بے حیثیتی، مال و متاع کی بے قیمتی، اور منصب و جاہ کی بے ثباتی اس قدر وضاحت اور شدت کے ساتھ نمایاں ہوئی کہ پورا عالم اسلام تصوف کی طرف جھک گیا تھا۔ محقق تو مغل بادشاہ، اور اس کے اردو کے ساتھ ساتھ رہ چکے تھے۔ انھوں نے دنیا سے بیزار کر دینے والے یہ مناظر اپنی آنکھوں سے اور بار بار دیکھے ہوں گے۔ ان تلخ اور ہولناک تجربوں نے قدرتی طور پر ان کی طبیعت کو تصوف کی طرف کھینچ لیا ہو گا۔

علمی تصنیفات کے علاوہ محقق کو شعر گوئی کا بھی شوق تھا۔ اگرچہ شاعر کی حیثیت سے ان کی کوئی خاص شہرت نہیں ہوئی، نہ ان کا کلام کافی مقدار میں ملتا ہے۔ لیکن جو چند شعر ان کی طرف منسوب ہیں ان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ محقق کو شعر کہنے کا بھی خاص سلیقہ تھا۔ وہ عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ ذیل میں ان کے فارسی کلام سے چند نمونے پیش کر کے مضمون ختم کیا جاتا ہے:

رباعی

موجود بہ حق واجب اوّل باشد — باقی ہمہ موہوم و مخیّل باشد — ن واحد
ہر چیز جز او کہ آید اندر نظرت — نقش دو میں چشم احول باشد — ن متوہم

رباعی

(جو بابا افضل کاشانی کی خدمت میں بہ طور سوال لکھ کر بھیجی گئی)

اجزائے پیالہ اے کہ درہم پیوست — بشکستن آں روا نمی دارد مست
چندیں سر و پائے نازنین و سر و دست — از بہر چہ ساخت و زبہر چہ شکست

(یہ رباعی عمر خیام کے نام سے بھی منسوب ہے)

قطعہ

(بابا افضل کاشانی کی مدح میں)

گر عرض دہد سپہر اعلیٰ   فضل فضلا و فضل افضل
از ہر ملکے بجائے تسبیح   آواز آید کہ "افضل افضل"

قطعہ

نظام بے نظام ار کافرم خواند   چراغ کذب را نبود فروغے
مسلماں خوانمش زیرا کہ نبود   سزاوار دروغے جز دروغے

اشعار

منم آں کہ خدمت تو کنم و نمی توانم   توئی آں کہ چارۂ من نہ کنی و می توانی
دلِ من کجا پذیرد بدلِ تو یاد گیرد   بہ تو دیگرے چہ ماند تو بہ دیگرے چہ مانی

رباعی

ای بے خبر ایں شکل موہوم ہیچ است   ویں دائرۂ سطح مجسم ہیچ است
خوش باش کہ در نشیمن کون و فساد   وابستۂ یک دمیم و آں ہم ہیچ است